سیاسی جماعتیں اور اسلام کا سیاسی نظام

جناب محمد دین صاحب ریاض یونیورسٹی

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآن حکیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل سے جو سیاسی تعلیمات واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ وہ ایک سیاسی نظام کا بنیادی ڈھانچہ تو فراہم کرتی ہیں، لیکن اس نظام کی فروعی تفصیلات ہمیں عطا نہیں کرتیں۔ مثلاً شوریٰ کی آیات اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل شوریٰ کو واجب تو ضرور ٹھہراتا ہے لیکن اس کی تفصیلات مہیا نہیں کرتا کہ مجلس شوریٰ کی تشکیل کیسے ہونی چاہیے؟ اس کے اعضاء میں کون سی صفات ہونی چاہئیں؟ سلطۂ تنفیذیہ اور قضائیہ سے اس کا تعلق کیسا ہونا چاہیے؟ اس کا دائرہ کار کیا ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور دوسرے بہت سے فروعی سوالات ہیں جن کے جوابات شارع نے ہمیں نہیں دیئے ہیں۔

اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ایسا کسی خامی اور کمزوری کی بنا پر نہیں ہوا بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی حکمت پوشیدہ کر رکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان ہر زمانے میں اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق اس کی تفصیلات طے کرتے رہیں اور یہی شریعت اسلامی کے مزاج کے مطابق بھی ہے کیونکہ اس شریعت کو تا ابد قائم رہنا ہے اور اگر کچھ جامد جوابات ان سوالات کے دیئے بھی جاتے تو وہ ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات میں کامیاب نہ ہو سکتے اور یہ بات شریعت اسلامی کے دوام اور کمال کے خلاف ہوتی۔

اسلام کا سیاسی نظام اپنی صحیح سپرٹ میں صرف خلفاء راشدین کے زمانے میں جاری رہ سکا۔ اور بعد میں انحرافات کا شکار ہو گیا۔ بیسویں صدی میں جب مسلمان ممالک مغربی استعمار سے آزاد

ہوتا شروع ہوتے تو مسلمان ملکوں کی اکثریت نے اس سیاسی نظام کو اپنا لیا جو استعماری قوتوں نے ان کے ہاں وضع کیا تھا، یا جہاں بھی ضرورت پڑی ان استعماری قوتوں کے دساتیر اور قوانین کی نقل کرنے کرنے پر اکتفا کیا[1] اور یہ بھول گئے کہ اسلام خود مکمل نظامِ زندگی ہے اور جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں اُس نے رہنمائی مہیا کی ہے وہاں ہمیں ایک سیاسی نظام بھی دیا ہے۔ اب جب کہ تقلید کی دھند چھٹنا شروع ہوئی ہے اور مسلم ممالک میں ان قوتوں نے زور پکڑنا شروع کیا ہے، جو اسلامی نظام کی حامی ہیں اور اسلام کی سیاسی تعلیمات کو بھی نافذ ہوتے دیکھنا چاہتی ہیں تو یہ سوال سامنے آیا ہے کہ مغربی استعماری قوتوں نے جو سیاسی نظام ہم کو دیا ہے وہ کس حد تک اسلامی ہے اور اس کی کون کون سی چیزیں قابلِ قبول ہیں اور کون کون سی چیزیں مردود اور ناقابلِ قبول ہیں۔ اسی طرح ایک سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی نظامِ حکومت میں اس طرح کی سیاسی جماعتوں کی گنجائش نکل سکتی ہے جس طرح کی سیاسی جماعتیں آج کل مغربی نظامِ سیاست کے تتبع میں مسلمان ملکوں میں پائی جاتی ہیں۔

لیکن اس بات کا فیصلہ اُس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک یہ طے نہ کر لیا جائے کہ سیاسی جماعتیں کیا ہوتی ہیں، اُن کے اغراض و مقاصد کیا ہوتے ہیں اور وہ کس طرح کام کرتی ہیں

سیاسی جماعتوں کی تعریف | ڈاکٹر سلیمان محمد الطماوی نے ایک سیاسی جماعت کی یہ تعریف کی ہے

> "متحد الخیال افراد کی وہ جماعت جو مختلف جمہوری ذرائع سے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اپنے طے شدہ پروگرام پر عمل درآمد کے لیے۔"[2]

ڈاکٹر ابراہیم درویش، پروفیسر سارتوری اور رسموئیل ایدرسولڈ اور دوسرے اہلِ علم نے بھی سیاسی جماعت کی اسی سے ملتی جلتی تعریف بیان کی ہے۔[3]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علی منصور کی کتاب "نظام الحکم والادارۃ فی القانون التونسی والفقہ الاسلامی" ص ۱۵۔ اور اس کے بعد طبع دار الفتح بیروت ۱۳۹۱ھ۔

[2] ڈاکٹر سلیمان محمد الطماوی "السلطات الثلاث"، صفحہ ۱۲۸ طبع دار الفکر العربی ۱۹۶۹ء

[3] ملاحظہ ہو: — PARTIES & PARTY SYSTEMS BY GIOVANNI SAVTORI P-59 PUBLISHED BY CAMBRIDGE UNIVERSITY PRESS 1976

اس تعریف سے پتہ چلتا ہے کہ ایک سیاسی جماعت میں چار خصوصیات ہوتی ہیں۔

۱۔ ہم خیال افراد کے مجموعے پر مشتمل ایک جماعت۔

۲۔ اس کے پاس ایک سیاسی پروگرام کا ہونا۔

۳۔ وہ جمہوری ذرائع سے کام کرتی ہے۔

۴۔ حصول اقتدار کے لیے جدوجہد[1]

سیاسی جماعتوں کی نوعیت، ہدف اور طریق کار

سیاسی جماعتیں اس اصول پر مبنی ہیں کہ ایک ریاست میں سیاسی ادارے بنانے اور چلانے کے سلسلے میں اصل قوت کے مالک عوام ہیں اور انہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اجتماعی امور کے بارے میں فیصلے کریں۔ اس طرح سیاسی جماعتیں نظریاتی طور پر عوام کی نمائندہ ہوتی ہیں اور ان کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں عوام کی رائے کو پیش کریں۔ اور اقتدار ملنے پر اس کو نافذ کریں۔ اس طرح سیاسی جماعتیں جن اہداف کے لیے کام کرتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ سیاسی جماعتیں، انتخابات میں اپنا پروگرام عوام کے سامنے پیش کرکے ان کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور جو جماعت عوام کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے وہ حکومت بناتی ہے اور برسر اقتدار جماعت اگر عوام کی حمایت حاصل نہ کر سکے تو وہ ...

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

— POLITICAL PARTIES - A BEHAVIORAL ANALYSIS BY SAMUEL J. ELDERSVELD P 1 PUBLISHED VORA & CO BOMBAY 1971

ڈاکٹر ابراہیم الدرویش، الدولہ - نظریتہا وتنظیمہا صفحہ ۱۲۵ طبع دار النہضۃ العربیۃ ۱۹۶۹ء

[1] اگرچہ بعض سیاسی مفکرین کا کہنا ہے کہ سیاسی جماعتیں اقتدار حاصل کرنے کے لیے جدوجہد ضرور کرتی ہیں لیکن یہ ان کا ہدف نہیں ہوتا۔ ان کا حقیقی ہدف اپنے سیاسی پروگرام پر عمل درآمد کرنا ہوتا ہے۔ اور حصول اقتدار اس ہدف تک پہنچنے کا محض ایک وسیلہ ہے۔ ملاحظہ ہو: ہشام آل شاوی، المقدمہ فی علم السیاسۃ، صفحہ ۱۹۸ طبع جامعہ بغداد

کامیاب جماعت کے لیے حکومت چھوڑ دیتی ہے۔ اس طرح سیاسی جماعتیں گویا پرامن انتقالِ اقتدار کا ایک ذریعہ ہیں۔[۱]

۲۔ انتخابات میں حمایت حاصل کرنے کے لیے سیاسی جماعتیں عوام کے پاس جاتی ہیں مسائل کا تجزیہ کرتی ہیں اور ان کا مناسب حل پیش کرتی ہیں۔ انتخابی مہموں میں تقریروں، جلسوں، جلوسوں اخبارات میں مضامین اور پوسٹروں وغیرہ کے ذریعے عوام کی سیاسی تربیت ہوتی ہے اور ان میں اپنے حقوق کا شعور بڑھتا ہے۔[۲]

۳۔ انتخابات میں جیتنے والی جماعت حکومت بنا لیتی ہے اور ہارنے والی جماعت یا جماعتیں اس حکمران جماعت کے احتساب کا کام سرانجام دیتی ہیں تاکہ وہ دستوری اور قانونی حدود سے تجاوز نہ کرے اور عوام کے حقوق غصب کر کے مقتدرِ مطلق نہ بن بیٹھے۔[۳]

۴۔ بیوروکریسی ہمارے زمانے میں ایک بہت بڑی قوت بن چکی ہے اور ملک کے سیاسی امور میں اس کا دخل بہت وسیع ہو چکا ہے، ترقی پذیر ممالک میں (جن میں مسلمان ممالک بھی شامل ہیں) خصوصاً نوکر شاہی کے قدم بہت مضبوط ہیں اور وہ اپنی من مانی کرتی ہے۔ سیاسی جماعتیں نوکر شاہی کو حدود میں رکھنے کی جدوجہد کرتی ہیں اور رائے عامہ کو منظم کر کے ان کے مسائل حل کرانے کی کوشش کرتی ہیں۔[۴]

---

[۱] موریس دافرجیہ، الاحزاب السیاسیۃ ص ۷، طبع دار النہار المنشر المطبع الثانیہ ۱۹۷۷ء

[۲] — THE LOGI OF PARTY DEMOCRACY BY ALAN WANE, P. 71 PUBLISHED BY BILLANG & SONS, LTD, UK 1979

ڈاکٹر بطرس غالی "المدخل کا علم السیاسہ" صفحہ ۶۱، مکتبۃ الانجلو مصریۃ الطبع الرابعہ، ۱۹۷۴ء

[۳] ہشام آل شاوی "مقدمہ فی علم السیاسہ" صفحہ ۱۹۸، طبع دار الکتب للطباعۃ والنشر موصل۔

[۴] محمد صلاح الدین، اسلامی حکومت میں سیاسی جماعتوں کا کردار، جسارت عدد ۱۰۰، ۱۳/

گویا سیاسی جماعتوں کا فلسفہ جس عمارت پر قائم ہے، اس کے اہم ستون یہ ہیں :-

— اختلاف رائے اور اس کی بنیاد پر جماعتوں کا بننا،

— حصول اقتدار کے لیے، دستوری حدود کے اندر، ان جماعتوں کی منافرت اور عوام کی حمایت کی بنیاد پر حکومت کا بننا،

— جو جماعت اقتدار نہ حاصل کر سکے، اس کا برسر اقتدار آنے والی جماعت کا احتساب کرنا۔

گویا اختلاف رائے، انتقال اقتدار اور احتساب، سیاسی جماعتوں کے اہداف کے مرکزی نقاط ہیں۔ آیئے ان امور کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر جاننے کی کوشش کریں۔

اوّلاً اختلاف رائے لوگوں کے درمیان رائے کا اختلاف ہونا ایک فطری امر ہے اور اسلام جو دینِ فطرت ہے اس کو تسلیم کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

— "ولو شاء ربك لجعل الناس امة واحدة ولا يزالون مختلفين" (هود - ۱۱۸)

— "وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا ..." (الحجرات - ۱۳)

— "ولو شاء لجعلهم امة واحدة ولكن يدخل من يشاء في رحمته" (الشورى - ۸)

— "ولو شاء ربك لآمن من في الارض كلهم جميعا افانت تكره الناس حتى يكونوا مومنين" (يونس - ۹۹)

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

"اختلاف امتی رحمة"[1]

اور یہ اختلاف جس کا جواز نصوص سے ثابت ہو رہا ہے، کسی خاص شعبۂ زندگی سے مخصوص نہیں ہے

[1] طاش کبریٰ زادہ نے مفتاح السعادہ جلد دوم صفحہ ۸۰ (طبع دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد دکن، ۱۳۲۸ھ) میں اسے حضرت امام مالکؒ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

بلکہ انسانوں کے درمیان یہ اختلاف عقائد میں بھی ہو سکتا ہے، یا پھر ایک ہی عقیدہ رکھنے والوں کے اندر نصوص کی تعبیر پر یا فروعی معاملات کی تفصیلات پر یا اجتماعی اور سیاسی اُمور میں اُصولوں کی عملی تطبیق پر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اختلاف انفرادی سطح پر بھی ہو سکتا ہے اور اگر بہت سے لوگ کسی ایک رائے سے متفق ہوں تو یہ اختلاف جماعتوں اور دھڑوں میں اختلاف کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے جیسا کہ سقیفہ بنی سعدیہ میں انصار و مہاجرین کے درمیان اختلاف ہوا یا حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ و طلحہؓ اور حضرت علیؓ و امیر معاویہؓ کے درمیان ہوا۔

اصل میں جو چیز اسلام میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے وہ "حق" ہے اور احقاق حق اور غلبۂ حق ہے اختلاف اور اتحاد نہیں۔ اگر اختلاف ہر حالت میں بُرا اور اتحاد ہر حالت میں مطلوب ہوتا تو دینِ حق کا آج وجود تک نہ ہوتا، کفارِ قریش کا تو ایک بڑا الزام یہی تھا کہ محمدؐ نے ہمارے اندر تفریق ڈال دی ہے۔ بھائی کو بھائی سے اور ماں کو بیٹے سے جدا کر دیا ہے اور یہ بالکل صحیح تھا، بلکہ اس سے بڑھ کر جنگ بدر میں تاریخ اس کی شاہد ہے کہ بھائی نے بھائی کے خلاف اور بیٹے نے باپ کے خلاف تلوار اُٹھائی اور خود مسلمانوں کے اندر بھی اگر احقاق حق اور غلبۂ حق کی بات نہ ہوتی اور اتحاد ہر حالت میں مطلوب ہوتا تو سیاسی میدان میں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ جیسے جلیل القدر صحابۂ کرام ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرتے اور نہ اُن کی جنگوں میں ہزاروں مسلمان ہلاک ہوتے۔ نہ حضرت حسینؓ کربلا میں شہید ہوتے اور نہ عبداللہ بن زبیرؓ حرم کعبہ میں۔

اسی طرح متقدمین و متاخرین علماء بلکہ صحابہ کرام اور تابعین سب کا اعتقادی اور فقہی اُمور میں آپس میں اختلاف ایک امر ثابت ہے اور یہ قطعاً قابلِ مذمت نہیں بلکہ محمود ہے[۱] کیونکہ اس سے اسلامی قانون اور شریعت کی وسعت و ثروت، پائیداری اور ہر زمانے اور ہر ماحول میں اس کے قابلِ عمل ہونے کی شہادت ملتی ہے

---

[۱] خصوصاً مغرب کے علماء قانون اور اس قانونی اختلاف کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو پیرس ۱۹۵۱ء میں ہفتہ فقہ اسلامی میں منظور کی جانے والی قرار داد (عن علی علی منصور، نظم الحکم والادارۃ فی الشریعۃ والقوانین ص ۳۸، طبع دار الفتح بیروت ۱۳۹۱ھ -

نصوص سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اختلاف بالعموم تین حالتوں میں مذموم ہوتا ہے۔

۱۔ اگر یہ اصولوں میں ہو۔ فرعی اُمور میں اختلاف قابلِ مذمت نہیں ہے[۱] مثلاً اگر کوئی کہے کہ سنّت کی کوئی دستوری حیثیت نہیں تو یہ قابلِ مذمت ہے لیکن اگر کوئی کہے کہ میں استحسان کو صحیح شرعی دلیل نہیں سمجھتا تو یہ علمی اختلاف ہے کہ اس کی مذمت نہیں کی جانی چاہیے۔

۲۔ اگر اختلاف سے مقصود عداوت اور زیادتی کرنا ہو[۲]

"وما تفرقوا الا من بعد ما جاءھم العلم بغیا بینھم"

(الشوری - ۴۲)

۳۔ اگر اس اختلاف سے مسلمانوں کے اندر فتنہ و فساد پھیلے اور تنازعات بڑھیں۔

"ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم" (الانفال)

اِن حالات کے علاوہ اسلام اختلاف رائے کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ یہ غلط نہ ہوگا اگر ہم کہیں کہ اسلام اختلاف رائے پر اُبھارتا ہے، مثلاً نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث ہے۔

"انصر اخاک ظالماً او مظلوماً"[۳]

یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

---

[۱] الرسالۃ للشافعی صفحہ ۵۶۰ طبع مصطفیٰ بابی الحلبی - الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۵۸ھ تحقیق احمد شاکر۔

شیخ عبداللہ دراز فی شرح الموافقات للشاطبی جلد ۴ ص ۱۱۹ طبع مکتبۃ التجاریہ

[۲] شیخ عبداللہ دراز الموافقات کی شرح میں کہتے ہیں کہ جس تفرق سے منع کیا گیا ہے یہ وہ تفرق ہے جو عداوت پر مبنی ہو یا اصولوں میں اختلاف اور تکفیر ہو ورنہ تو یہ اختلاف مسلمانوں میں بھی موجود ہے بلکہ صحابہ کرامؓ میں بھی رہا ہے لیکن نعوذ باللہ صحابہ پر اختلاف و تفریق کی اس مذمت کا اطلاق نہیں جو قرآن میں مذکور ہے۔

("ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات" - آل عمران - ۱۰۵)

[۳] صحیح بخاری جلد سوم ص ۹۸ طبع استانبول ۱۴۰۱ھ

سنن الدارمی جلد دوم ص ۳۱۱ طبع دار احیاء السنۃ النبویۃ تحقیق محمد احمد دھمان

اور مزید وضاحت کی کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ تم اسے ظلم سے باز رکھو۔ اب اگر ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش ہو تو کیا اس سے اختلاف رائے نہ ہوگا بلکہ بعید نہیں کہ مار پٹائی اور مقاتلے تک نوبت پہنچے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے " افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر[1] یعنی ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر حاکم کی ہاں میں ہاں ملانی ہو تو کسی جہاد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ اس کی ضرورت تو اسی وقت پڑتی ہے، جب اس سے اختلاف رائے ہو اور اس کی مرضی کے خلاف حق بات اس کے سامنے رکھی جائے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر حاکم کی رائے اسلامی مقتضیات کے مطابق نہ ہو تو اس سے لازماً اختلاف کرنا چاہیے اور حق بات اس پر واضح کرنی چاہیے اور اس اختلاف رائے اور احقاق حق کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد قرار دیا۔ گویا ایسا اختلاف کرنے والا مجاہد کا درجہ رکھتا ہے چہ جائیکہ ایسے اختلاف کو مذموم سمجھا جائے۔

دوسری بات یہ کہ جماعت بنانا اور گروہ بندی بھی ہر حالت میں مذموم نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں تو عین مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔ (آل عمران - ۱۰۴)

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔ (التوبہ - ۱۲۲)

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جماعت بندی چار کاموں کے لیے اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

اولاً : دعوت الی الخیر کے لیے۔

[1] سنن ابی داؤد جلد چہارم ص ۱۴ طبع استانبول ۱۴۰۱ھ

ثانیاً: امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے۔
ثالثاً: تفقہ فی الدین کے لیے۔
رابعاً: تبلیغ اور دعوتِ دین کے لیے۔

اب اگر ان کاموں کے لیے گروہ بندی مطلوب ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب ہے تو یہی کام اگر ایک سے زیادہ گروہ مختلف طریقوں پر کریں تو یہ عنداللہ مغضوب تو نہیں ہو جائیں گے محبوب ہی رہیں گے۔[1]

پھر یہ کہ اگر منکر کی قوت مضبوط ہے یا منکر کے پس پردہ قوتیں مجتمع ہیں تو اس کے خلاف متحرک ہونے کے لیے انفرادی کوششیں بیکار ہو جائیں گی اور اجتماعی کوششیں درکار ہوں گی۔ ابھی جس حدیث کا ہم نے ذکر کیا ہے اس کے مطابق اگر ایک فرد یا چند ایک فرد دفع ظلم پر قادر نہیں ہوتے تو اُن کا ایک طاقتور جماعت بن کر ظلم کو دفع کرنا عین محمود ہونا چاہیے۔ اسی طرح دوسری حدیث کے مطابق اگر ایک آدمی ظالم حاکم کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت نہ کر سکے یا اُس میں ناقابلِ برداشت مشقت ہو تو حق پہنچانے کے لیے اجتماعی کوشش کرنا یا اُس کے لیے جماعت بنانا حکم نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق جہاد ہونا چاہیے، کیوں کہ شارع علیہ السلام کا حکم تو اسی طرح پورا ہو سکتا ہے۔[2]

---

[1] اسی لیے ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ جو جماعت حق اور خیر کی دعوت دے اور اُمت کے مصالح کی تحقیق کا سبب بنے تو وہ "حزب اللہ" کی قبیل سے ہے۔ ملاحظہ ہو "مجموعۃ الرسائل والمسائل" جلد اوّل صفحہ ۱۴۱ طبع الریاض۔

[2] یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ دعوتِ دین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام تو دینی جماعتوں کا ہے اور سیاسی جماعتوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نیز دعوتِ دین کو پھیلانا یہ مسلّم طور پر ایک اسلامی حکومت کے اہداف میں سے ہیں اور اگر آج کی سیاسی جماعتیں یا اُن کے دساتیر اِن اُمور سے خالی ہیں تو یہ ایک کمزوری ہے جسے دُور کیا جانا چاہیے اور ایک اسلامی حکومت یہ انتظام کر سکتی ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

ثانیاً: سیاسی جماعتیں اقتدار کے لیے عوام کی حمایت سے پُرامن اور دستوری جد و جہد کرتی ہیں اور ہماری رائے میں یہ امر اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے اور نہ ہی اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کا اطلاق ہوتا ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے:

انا واللہ لا نولی ھذا العمل[1]

احداً سالہ او احداً حرص علیہ[2]

اور نہ اس آیت کا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

لا تزکوا انفسکم..... (النجم - ۳۲)

کیونکہ:

۱- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز سے منع فرمایا ہے وہ (اپنی ذات کے لیے) منصب و امارت کی حرص[3] کیونکہ یہ روحانی مرض کی نشان دہی کرتی ہے اور فتنے کا سبب بن سکتی ہے جس میں جاہ و مال کا فتنہ سب سے نمایاں ہے لیکن سیاسی جماعتیں جب ایک دستوری طریق کار کے مطابق کام کرتی ہیں اور اس کے نمائندے عوام کے پاس طلب حمایت کے لیے جاتے ہیں تو وہ اپنی ذات کے لیے کسی منصب کے خواہاں نہیں ہوتے بلکہ اپنی جماعت کے لیے اور اس کے پروگرام کے لیے حمایت طلب کرتے ہیں۔

۲- ایسے اقدامات کیے جا سکتے ہیں کہ الیکشن کمیشن یا سیاسی جماعتوں کی کارکردگی کو منضبط کرنے کے لیے حکومت ایک ادارہ قائم کرے اور یہ ادارہ انتخابات کرانے کا ایسا انتظام کرے

(حاشیہ صفحہ سابقہ) کہ وہ کسی جماعت کو اس وقت تک ایک سیاسی جماعت کے طور پر رجسٹر نہ کرے جب تک وہ اپنے دستور میں ان باتوں کا اقرار نہ کرلے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] یعنی منصب اور امارت

[2] صحیح مسلم جلد دوم ص ۱۴۵۶ طبع استنبول ۱۴۰۱ھ

[3] ورنہ حرص فی نفسہ کوئی بری جبلت نہیں جبکہ حرص غلط چیز کی نہ ہو مثلاً حرص اگر علم کی ہو، تقویٰ کی ہو، تو مندوب ہے اور اگر دولت کی ہو، جاہ کی ہو تو بری ہے۔

جس میں "تزکیہ نفس" کی ضرورت ہی نہ ہو، ایسے مجوزہ اقدامات کی تفصیل ابھی بعد میں بیان کی جائے گی۔
اگر اقتدار و سیادت کی طلب ہر حالت میں اور ہر غرض کے لیے ناپسندیدہ ہوتی تو خود باری تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت سے پہلے یہ دعا نہ سکھاتے۔ "وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا (بنی اسرائیل - ۸۰)
اوپر ذکر کردہ آیات و احادیث کی روشنی میں ہماری رائے یہ ہے کہ اقتدار و سلطان کی خواہش اور یہ کوشش مردود ہے۔ اگر اس کے پیچھے اپنے لیے یا اپنے قبیلے اور خاندان کے لیے حرص جاہ و مال ہو لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا جب دینی اور دنیوی مصالح، عام مسلمانوں کے لیے پیش نظر ہوں اور ہماری اس بات کی شہادت خود قرآن مجید دے رہا ہے۔ سورہ یوسف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف نے بادشاہ سے کہا۔ قال اجعلنی علی خزائن الارض، انی حفیظ علیم (یوسف - ۵۵) حضرت یوسفؑ نے جو اللہ کے پیغمبر تھے، بادشاہ سے منصب کا مطالبہ تو اسی لیے کیا تھا کہ اس میں انہیں عوام کے لیے خیر کا پہلو نظر آ رہا تھا اور دعوت دین کے لیے لوگوں پر اثر انداز ہونے کا ایک موقع میسر آ رہا تھا۔ لہٰذا انہوں نے "تزکیہ نفس" کے پہلو سے بھی کوئی برائی نہیں سمجھی۔ اس سے یہ بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ اگر کوئی شخص آج منصب و حکومت اس لیے طلب کرے کہ وہ دین کے نظام کو قائم کرنا چاہتا ہے، شریعت کو نافذ کرنا چاہتا ہے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عملی اہتمام کرنا چاہتا ہے تو یہ بلا ادنیٰ تردد جائز ہے۔ اور اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حدیث کا اطلاق نہیں ہوتا۔
لہٰذا اس امر میں فیصلہ کن بات خواہش اور نیت کی ہے، شخصی جاہ و مال کے لیے حکومت کی خواہش مردود ہے تو اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے یہی خواہش اور کوشش نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض حالات میں وجوب کی حد تک جا پہنچتی ہے خصوصاً جب دین کی حدود کو توڑا جا رہا ہو اور خدائی احکام کا مذاق اڑایا جا رہا ہو۔[1]

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن جلد دوم ص ۶۳۸ - ادارہ ترجمان القرآن ۱۹۷۹ء

اس سلسلے میں دوسری بات یہ کہ ۔

سیاسی جماعتیں پُرامن انتقالِ اقتدار کا اہم ترین ادارہ ہیں اور اسلام کے سیاسی نظام میں پُرامن انتقالِ اقتدار کی بہت زیادہ اہمیت ہے ۔ اور اس غرض کے لیے ایک مستقل سیاسی ادارے کے عدم وجود ہی نے مسلمانوں کی ملی تاریخ کے بعض بڑے سانحوں کو جنم دیا ہے ۔ مامون اور امین کی جنگ اور اورنگزیب کی بھائیوں کے خلاف جنگ تو اس کی ایک سادہ سی مثال ہے ورنہ اگر آپ دقتِ نظر سے دیکھیں تو حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان اختلاف اور جنگیں، خوارج اور شیعہ کا ظہور، حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیرؓ کی قیادت کو صالح ہاتھوں میں منتقلی کی خواہش ۔ پھر بنوامیہ اور بنوعباس کی اقتدار کے لیے چپقلش اور خونریزی اور اس کے ساتھ ہی سادات کی حکومت کے لیے تگ و دو غرض ایک طویل سلسلہ واقعات و حوادث ہے جو ہماری ساری تاریخ پر حاوی ہے[1] بلکہ آج بھی اگر دیکھا جائے تو مسلم دنیا کا مسئلہ یہی ہے، کیونکہ اکثر مسلم ممالک میں فوجی لوگ قوت کے بل پر غلبہ حاصل کیے ہوتے ہیں اور جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے حالانکہ مسلم عوام کی مرضی کا ان کے برسرِ اقتدار رہنے میں کوئی دخل نہیں ہے ۔

ان حالات میں اگر ہم نئے سرے سے حالات پر غور کریں اور یہ مت بھولیں کہ ماضی میں برسوں تک برائے نام خلافت کے نام پر جو بادشاہی نظام مسلم معاشرے میں رائج رہا ہے، وہ عین اسلامی نظام نہیں تھا اور یہ بھی کہ حالات کے دباؤ کے تحت، اسلام کے مزاج کے مطابق سیاسی ادارے ماضی میں ہم قائم نہیں کر سکے اور بہت جلد ہمارے سیاسی نظام کی گاڑی پٹڑی سے اتر گئی اور پھر بدلے ہوئے حالات میں ایک نیا سیاسی ڈھانچہ قائم کرنے پر غور کریں تو منظم سیاسی جماعتوں کے ذریعے جو مسلم عوام کی نمائندہ ہوں، انتقالِ اقتدار کا عمل ایک انتہائی مناسب حل ثابت ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کو خونریزی، بدامنی اور فساد سے بچا سکتا ہے اور انہیں ایک پُرامن مستقبل کی نوید دے سکتا ہے۔

---

[1] اسی لیے شہرستانی نے یہ کہا ہے کہ "امتِ مسلمہ میں اختلاف کا ایک بہت بڑا سبب خلافت و امامت کا مسئلہ ہے اور اسلام میں کسی دوسرے دینی مسئلے پر اتنی خونریزی نہیں ہوئی جتنی اس مسئلے پر امت میں ہر زمانے میں ہوئی" ملاحظہ ہو الملل والنحل جلد اول ص ۲۴ طبع دارالمعرفہ بیروت ۱۹۷۵ء ۔

ہماری اس رائے کو تقویت اس امر سے بھی پہنچتی ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں انتقالِ اقتدار کا کوئی متعین طریقہ نہیں ہے کیوں کہ:

——حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن آپ نے نہ تو کسی کو نامزد فرمایا اور نہ اس سلسلے میں کوئی واضح ہدایت چھوڑی۔

——حضرت ابوبکرؓ کو عام لوگوں نے منتخب کیا اور انھوں نے وفات سے پہلے شوریٰ کے مشورے سے حضرت عمرؓ کا نام پیش کر کے عام مسلمانوں سے اس کی منظوری لی۔

——حضرت عمرؓ نے اوپر کی دونوں باتوں سے الگ چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنا دیا جائے۔

——مسلم اکابرین کے توسط سے حضرت علیؓ کی بیعت ہوئی۔

——حضرت معاویہؓ نے قوت سے حکومت پر قبضہ کر لیا۔

——اور بعد کے ادوار میں خلافت بادشاہت میں بدل گئی۔

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں کوئی متفق علیہ طریقہ انتقال اقتدار کا نہیں ہے اور نہ اس سلسلے میں کوئی منصوص حکم ہے بلکہ یہ ایک مباح امر ہے جس میں حالات کے مطابق فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور بلا تردد پہلے فیصلے کو بدلا جا سکتا ہے۔ یہ تو ضروری ہے کہ ایسا کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ہم ماضی کی نظیروں کو سامنے رکھیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ آج ہم اپنے ہاں انتقالِ اقتدار کے لیے نئے ادارے تجویز کرتے ہوئے یا بناتے ہوئے ان اداروں اور طریقوں کی صوری اور شکلی صورت میں بھی پیروی کریں جو آج سے چودہ سو سال پہلے اُس وقت کے حالات کے مطابق اختیار کیے گئے تھے[1] اور نہ کسی کے لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ آج جو ادارے ہم اپنے حالات کے مطابق تجویز کریں اور بنائیں وہ غیر اسلامی ہیں، اس لیے کہ یہ ان اداروں سے مختلف ہیں جو خلفائے راشدین نے اس غرض کے لیے بنائے تھے اور صحیح صورت

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ، نظریۃ الاسلام وہدیہ، ص ۲۹۰ طبع مؤسسۃ الرسالہ بیروت۔

یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کا ان اداروں کو تشکیل دینا ایک امر اجتہادی تھا اور یہ ایک معروف اور متفق علیہ حقیقت ہے کہ وقت اور جگہ کے ساتھ ساتھ اور حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ اجتہادی فیصلے بدل جاتے ہیں[1] لیکن اس اجتہادی آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں مغرب کی اندھی پیروی کرنے کا لائسنس مل گیا ہے بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ اگر آج ہم نے ہو بہو سلف کے طریقوں کو اپنانے کے (انتقال اقتدار کے لیے) مکلف نہیں ہیں۔ کیونکہ آج حالات بدل چکے ہیں تو اسی طرح ہمیں مغرب کے جمہوری طریقوں کی بھی اندھی پیروی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ہمارے اور اُن کے معتقدات اور معاشروں میں زمین و آسمان کا فرق ہے[2]۔

اِن حالات میں اگر ہم سیاسی جماعتوں کو پُرامن انتقال اقتدار کے لیے ایک ادارہ کے طور پر استعمال کریں تو یہ عین اسلامی ہوگا[3] بشرطیکہ ہم ان جماعتوں سے بچنے کا انتظام کریں جو مغرب کے جمہوری نظام میں مروّج ہیں اور ایسی تفصیلات طے کر لیں بلکہ ایک ایسا نظام وضع کر لیں جو سیاسی جماعتوں کے ذریعے انتقال اقتدار کو مسلمانوں کے درمیان فتنہ و فساد اور تعصب و زیادتی کا سبب نہ بننے دے[4]

۱؎ ابن قیم الجوزیہ، اعلام الموقعین، جلد سوم ص ۱ طبع دار الجیل، بیروت۔

۲؎ آگے چل کر اس پر ہم مزید روشنی ڈالیں گے۔

۳؎ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کے نظام کی بنیاد جن امور پر ہے وہ یہ ہیں: سیاسی سرگرمیوں کی آزادی، اختلاف کا حق، عوام کا یہ حق کہ حکمرانوں کا بننا اور رہنا اُن کی صوابدید پر منحصر ہو اور حکمرانوں کا احتساب تو یہ وہ مبادی ہیں جو سب کے سب اسلام میں مقبول ہیں اور خلفائے راشدین نے اپنے حالات کے مطابق ان مبادی کی حفاظت اور ان پر عمل کرنے کے لیے ایک سیاسی ڈھانچہ بنایا تھا۔ اسی طرح ہم اپنے بدلے ہوئے حالات کے مطابق ایک سیاسی ڈھانچہ بنا سکتے ہیں۔ اور اگر یہ ڈھانچہ ان مذکورہ مقاصد کو پورا کرتا ہے تو وہ عین اسلامی ہوگا، قطعِ نظر اس کی شکل و صورت کے۔

۴؎ اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مغرب میں تو سیاسی جماعتیں، سیاسی امن و استقرار اور ملک کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کی ضمانت سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن اسلامی ملکوں میں جہاں (باقی بر صفحہ آئندہ)

اور ایسا نظام یقیناً وضع کیا جا سکتا ہے۔ ہماری رائے میں اس نظام کے خدوخال یہ ہونے چاہئیں۔
سیاسی جماعتیں بنانے اور چلانے کے سلسلے میں یہ رہنما اصول رکھے جائیں۔

اوّلاً:۔ کسی سیاسی جماعت کو اس وقت تک رجسٹرڈ نہ کیا جائے جب تک اس کے دستور میں بصراحتً مذکور نہ ہو کہ:

i۔ وہ اسلامی تعلیمات اور مبادی کی خلاف ورزی نہ کرے گی۔

ii۔ وہ اقتدار ملنے پر شریعتِ اسلامی کو نافذ کرے گی اور دعوت و تبلیغ کے لیے مملکت کے وسائل کا ایک حصہ خرچ کرے گی۔

iii۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے گی خواہ وہ حکومت کے اندر ہو یا باہر۔

iv۔ وہ مسلمانوں کے اندر اتحاد و تعاون کے لیے مختلف اقدامات کرے گی۔

v۔ وہ ان مذکورہ بالا اہداف کے حصول کے لیے اور اپنے سیاسی پروگرام کو نافذ کرنے کے لیے، دستوری حدود کے اندر پُرامن جدوجہد کرے گی۔

ثانیاً:۔ کسی ایسی سیاسی جماعت کو کام کرنے کی آزادی نہ ہوگی جو:

i۔ علاقائی جماعت ہو اور ساری مملکت میں اس کا وجود نہ ہو کیونکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ملک کے بعض حصوں کے لیے تعصب رکھنا اور بعض کو نظر انداز کر دینا یا ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا ناجائز ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) سیاسی جماعتیں ان ملکوں کے تتبع میں آئی ہیں، وہاں انہیں ملک توڑنے اور ملکوں کے امن و امان کو برباد کرنے کا سبب گردانا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب سیاسی جماعتوں کا وجود نہیں بلکہ ہم ہیں، بلکہ زیادہ متعین طور پر ہمارا حکمران طبقہ ہے جو اپنی مجبوری کے طور پر جمہوریت اور نہ انتخابات کا نعرہ تو لگاتا ہے لیکن فی الاصل نہ وہ سیاسی جماعتوں کا وجود چاہتا ہے اور نہ انتخابات اور نہ آزادی بلکہ وہ اپنی من مانی کرنا چاہتا ہے اور وہ بھی ہر قیمت پر، ملک ٹوٹتا ہے تو ٹوٹے، ان کی کرسی کسی طرح سلامت رہنی چاہیے۔

ii — جو عامۃ المسلمین کے مفاد کی بجائے کسی خاص گروہ، فرقے، قبیلے اور برادری کے لیے بنائی گئی ہو۔ کیونکہ یہ امر مسلمانوں میں تفرقے اور اختلاف کا سبب بنے گا۔

iii — اگر اُس کی قیادت، نیچے سے لے کر اُوپر تک منتخب نہ ہو، کیونکہ اس کے بغیر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عوام کے نمائندے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو پارٹی شوریٰ اور جمہوریت کے مبادی کو اپنی پارٹی کے اندر نافذ نہیں کرتی وہ ملک میں کہاں کرے گی؟

iv — محبِ وطن ہونا اُس کی لازمی شرط ہو، ہر وہ پارٹی جس کی جڑیں ملک سے باہر ہوں یا اُس کو بیرونی امداد ملتی ہو، اُسے عوام میں کام کرنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔

ثالثاً :۔ عام انتخابات میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے:۔

i — کسی سیاسی جماعت کو اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ کسی قبیلے، نسل، زبان، برادری، صوبے یا فرقے[1] کی بنیاد پر ووٹ مانگے۔ یہ کام صرف جماعت کے پروگرام کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

ii — اسمبلی کے ہر اُمیدوار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اچھے اخلاق اور شہرت کا حامل ہو، بنیادی دینی فرائض بجا لاتا ہو اور کبائر سے اجتناب کرتا ہو اور کم از کم بی اے پاس ہو، یا کسی دینی مدرسے کا فارغ ہو۔ جس اُمیدوار میں یہ صفات نہ ہوں اور وہ بُری شہرت کا حامل ہو تو اُس کی نامزدگی کو الیکشن کمیشن یا متعلقہ ادارہ رد کرسکتا ہے۔

iii — پیشہ وارانہ ماہرین کی ایک تعداد کے علاوہ ہر جماعت کے لیے لازم ہوگا کہ وہ علماء دین اور علوم اسلامی کے سکالرز میں سے چند ایک کو نامزد کرے تاکہ وہ اسمبلی میں قانون سازی کے کام میں معاونت کرسکیں۔

[1] جہاں تک دینی اقلیتوں مثلاً ہندو، عیسائی، قادیانی وغیرہ کا تعلق ہے تو اُن کی آبادی کے تناسب سے اُن کے لیے الگ حلقہ ہائے انتخاب بنائے جاسکتے ہیں۔

۱۷ ـــ انتخابات متناسب نمائندگی کے تحت ہوں، کسی آدمی کو اجازت نہ ہو کہ وہ خود امیدوار کے طور پر کھڑا ہو جائے اور اپنی مہم اپنے پیسے سے چلائے بلکہ یہ سارے کام سیاسی جماعتیں کریں اور پھر بھی الیکشن مہم پر خرچ کرنے کے لیے ایک رقم کا تعین کر لیا جائے اور اس پر سختی سے عمل درآمد ہو۔

۷ ـــ جو امیدوار جعلی ووٹ بھگتوائے یا ایسی کسی دوسری بدنظمی اور خلافِ قانون حرکت میں ملوث ہو، اُسے آئندہ دو انتخابات میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دیا جائے۔ اور اس پر اخلاقی جرم کی حیثیت سے مقدمہ چلایا جائے۔ اور فوراً سزا دی جائے۔ اسی طرح جو آدمی کسی کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرے، الزام تراشی کرے، بدزبانی کرے، تہمت لگائے اس پر فوراً شرعی حد نافذ کی جائے۔

۱۸ ـــ اسمبلی میں ایک پارٹی سے ٹوٹ کر دوسری پارٹی میں شامل ہونا خلافِ قانون ہو۔ الّا یہ کہ وہ ممبر دوسری پارٹی کے ٹکٹ پر دوبارہ الیکشن لڑ کر کامیاب ہو۔[۱]

یہ چند تجاویز ہیں جو سیاسی جماعتوں اور انتخابات کے نظام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے میں ممد ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ صرف ایک طالب علمانہ کوشش ہے اور اس میں اضافے کی یقیناً گنجائش موجود ہے۔

ثالثاً:۔ کامیاب نہ ہونے والی سیاسی جماعت یا جماعتیں حکمران جماعت کی کارکردگی پہ نظر رکھتی ہیں تاکہ وہ اختیارات کے استعمال میں حدود سے تجاوز نہ کرے۔ اس کے علاوہ وہ نوکر شاہی کے کارپردازوں کو عوام پر ظلم و ستم سے باز رکھتی ہیں۔[۵] ماضی میں بھی یہ ہوا ہے کہ بعض نیک دل اور

(باقی بر صفحہ ۵۵)

[۱] لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر حالت میں پارٹی کی حمایت میں یا حکومت کی مخالفت میں ووٹ دے بلکہ وہ آزاد ہے اور اپنی آزاد مرضی سے جس کو برسرِ حق سمجھے اُسے ووٹ دے۔

[۵] — PARTIES & PARTY SYSTEM. BY G-SARTORI, P-66